AL-IDRAK RESEARCH JOURNAL
ریسرچ جرنل

OPEN ACCESS
Al-Idrak
Khasais-E-Nabwi (S.A.W)
ISSN (Online): 2789-3227
ISSN (Print): 2789-3235
www.alidrakresearchjournal.com

سیرت نگاری کے اصول ومبادی: عصری تناظر میں مطالعہ وجائزہ

Principles of Sīrah Writing: A Critical Analysis of Modern Trends

☆ **Dr. Rukhsana Shaheen Waraich**
Lecturer, School of Law, Quaid-e-Azam University, Islamabad.

☆☆ **Dr. M. Akram Vrik**
Post Graduate College Satellite Town, Gujranwala Professor, Department of Islamic Studies, Govt.

☆☆ ☆**Sadia Halima**
Researcher, UK

Citation:
Waraich, Dr. Rukhsana Shaheen, Dr. M. Akram Vrik and Sadia Halima, " Principles of Sīrah Writing: A Critical Analysis of Modern Trends."Al-Idrāk Research Journal, 2, no.1, Jan-June (2022): 126− 152.

ABSTRACT

The purpose of this study is to determine the key principles of writing the sīrah of Holy Prophet (SAW) as he is the source of light from whom the mankind should take guidance and emulate his exemplary character. The paper has analysed the different trends and styles of codification of the life of the beloved Prophet (SAW) through literature survey of biographies written in different eras. It is argued that unlike the Hadīth and fiqh, biographers of Beloved Prophet (SAW) didn't deduce and determine the principles of writing biography that resulted in certain discrepancies. The study has proposed a conceptual framework for a comprehensive and effective Prophetic biography based upon the premise that although every era brings different set of challenges and biographers must take them into consideration but there must be determined principles of writing biographies like principles of universality of Prophet (SAW), vitality of the message, goal orientation and practicality in daily life.

Key Words: Prophet (SAW), Sīrah, Uṣūl al-Sīrah, orientalists

موضوع کا تعارف، اہمیت اور پسِ منظر

تاریخِ اقوام میں تہذیبِ اسلامی کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ اس میں علوم کی جمع وتدوین پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے۔ علم و فکر کے ارتقاء اور استحکام کی اس مسلسل اور دیر پا اثرات کی حامل تحریک میں فنّی اور تکنیکی امور خصوصی طور پر اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ قرآنِ مجید، حدیثِ نبوی، تاریخ، سوانح اور سیرت سے متعلق جدید اور منفرد علوم کی جمع آوری، تشکیل و تنظیم، تجزیہ، اخذِ نتائج اور تعبیر و تشریح کے ضمن میں روایت ودرایت کے اصول ہمیشہ کارفرما

رہے ہیں۔ مسلمانوں کو اصولی طور پر اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ جب کوئی خبر ان تک پہنچے تو وہ اس کی صحت کے متعلق اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کریں، تاکہ بعد میں انہیں کسی قسم کی شرمندگی یا نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور یہ بھی دیکھ لیں کہ جو بات یا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ عقل، فطرت اور تسلیم شدہ حقائق کے خلاف نہ ہو۔ اسلامی علوم روایت اور درایت کے جن کڑے اصولوں پر جمع و تدوین کے مراحل سے گزرے ہیں، وہ اصول قرآنی فکر کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روایت کی تحقیق کا اصول خود بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ[1]

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (شخص) کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، (ایسا نہ ہو) کہ تم کسی قوم کو لاعلمی میں (ناحق) تکلیف پہنچا بیٹھو، پھر تم اپنے کئے پر پچھتاتے رہ جاؤ۔"

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت اصولِ درایت کی بنیاد ہے۔ ارشاد ہے: وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ[2] "اور جب تم نے یہ (بہتان) سنا تھا تو تم نے (اسی وقت) یہ کیوں نہ کہہ دیا ہمارے لئے یہ (جائز ہی) نہیں کہ ہم اسے زبان پر لے آئیں، (بلکہ تم یہ کہتے کہ اے اللہ!) تو پاک ہے، (اس بات سے کہ ایسی عورت کو اپنے حبیب مکرم ﷺ کی زوجہ بنا دے)، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔" جب منافقین نے حضرت عائشہؓ (م ۵۸ھ) پر تہمت لگائی اور اس تہمت کو اس طرح مشہور کر دیا کہ بعض صحابہ تک مغالطے میں آگئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سیدہ عائشہؓ کی برأت کا حکم قرآنِ مجید میں نازل فرمایا۔ عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے راویوں کے ناموں اور ان کے کردار کی تحقیق کی جاتی اور پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مقدسہ میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ ہی تم نے کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے، یعنی یہ بات تو اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کے ہی خلاف ہے کہ وہ اپنے نبی کے نکاح میں ایک ایسی عورت دے دے جس کا کردار ہی درست نہ ہو، گویا یہ رسول یا زوجۂ رسول پر نہیں بلکہ اللہ کی قدرت اور علم پر اعتراض ہے اور اہلِ ایمان کو اللہ کے بارے میں اس طرح

[1] الحجرات ۴۹: ۶۔
Al-Ḥujurāt,6:49.
[2] النور، ۲۴: ۱۶۔
Al-Nūr, 24:16.

کا شبہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس لئے آیت کا آخری جملہ ہی یہ ہے: '' سُبۡحَانَکَ ہٰذَا بُہۡتَانٌ عَظِیۡمٌ '' گویا یہ الزام درست تسلیم کرنا اللہ تعالیٰ پر الزام دینے کے مترادف ہے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ گویا محولہ بالا آیت میں اہلِ ایمان کی یہ تربیت کی گئی ہے کہ جو باتیں بعید از قیاس اور درایت (عقل) کے خلاف ہوں ان کو رد کرنے کے لئے یہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ اس کا راوی کون ہے۔

آغازِ اسلام سے ہی لوگوں کی ذہنی تشکیل میں ان قرآنی اصولوں کا بنیادی کردار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود عہدِ صحابہ میں روایات کے رد و قبول میں صحابہ کرامؓ نے ان اصولوں کی مکمل پاسداری کی۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کو ثقہ اور قابلِ اعتماد سمجھتے تھے لیکن محض یہ وجہ کہ کسی خبر کا راوی ثقہ ہے، قبولیت کا درجہ حاصل نہ کر سکتی تھی۔ صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کے بیان کو بھی روایت اور درایت کے اصولوں پر پرکھ کر ہی قبول کرتے تھے۔ اس نقطۂ نظر کی بیسیوں مثالیں صحابہ کرامؓ کی زندگی سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

صحابہ کرامؓ حدیث کی روایت میں کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) گھر پر آرام کر رہے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (م ۴۴ھ) نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کے لئے تین دفعہ اجازت طلب کی لیکن اجازت نہ ملنے پر واپس چلے گئے، بعد ازاں حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے واپس چلے جانے کا سبب پوچھا تو آپؓ نے اپنے اس عمل پر حدیث بطور دلیل پیش کی، جناب عمرؓ نے تقاضہ کیا کہ اس حدیث پر گواہ پیش کریں کہ یہ اللہ کے رسولؐ کا فرمان ہے، ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے جب گواہ پیش کر دیئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اے ابو موسیٰؓ! میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن میں ڈرا کہ کہیں لوگ رسول اللہؐ پر باتیں نہ گھڑ لیا کریں۔(i) صحابہ کرامؓ کے ہاں اصولِ درایت کس طرح کارفرما تھا؟ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۸ھ) نے جب ابنِ عباسؓ کے سامنے فرمایا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اگر یہ صحیح ہو تو پھر اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو۔(ii) گویا انہوں نے جناب ابو ہریرہؓ کی روایت کو درایت کی بنیاد پر رد کر دیا، حالانکہ دین کی روایت میں تمام صحابہ کرامؓ عادل اور سچے تھے اور ہر طرح کے تعصبات سے پاک تھے۔ گویا عہدِ صحابہ میں ہی روایت اور درایت کے اصولوں کا عملی برتاؤ شروع ہو چکا تھا۔ بعد کے دور میں محدّثین نے اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے ناموں سے جو فنون متعارف کروائے اس کے ابتدائی نقوش عہدِ رسالت اور صحابہ کرامؓ کے دور میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ (i) مالک بن انسؒ، الامام، (م ۱۷۹ھ) الموطأ، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان، (لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۸ء) ۷۸۲؛ (ii) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، الامام (م ۲۷۹ھ) جامع الترمذی، ابواب الطہارۃ، باب الوضوء مما غیرت النار، (الریاض: دار السلام، ۱۹۹۹ء) ۷۹

علومِ اسلامیہ کے دورِ تدوین میں روایت اور درایت کے یہ اصول، قرآنِ مجید کے مدوّنین، کتبِ حدیث کے مؤلّفین، سیرت نگاروں اور مؤرّخینِ اسلام کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے دینی ادب اور تاریخی ورثہ کو اس یقین کے ساتھ مدوّن نہیں کیا، ملتِ اسلامیہ کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی قوم ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر

سکتی۔ متنوع علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے حوالے سے اسلامی علوم کی تاریخ خصوصی امتیاز کی حامل ہے اور اسلامی ادبیات کے سدا بہار موضوعات میں سے ایک سیرت نگاری ہے۔ مسلمان اہلِ علم کے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ کے سیرت نگاروں کی فہرست میں جگہ پانا ایک عظیم سعادت ہے، اس سے زیادہ ایمان افروز حقیقت اور کیا ہوگی کہ سیرتِ محمدی کا چرچا آپ ؐ کی ولادت باسعادت سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔

اس موضوع پر اگرچہ کئی علماء نے قلم اٹھایا ہے لیکن اس حوالے سے جناب عبدالستار غوریؒ (م ۲۰۱۴ء) کی کتاب "Muhammad Fortold in the Bible by Name" (المورد: لاہور، ۲۰۰۹ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ تاہم علومِ اسلامیہ میں بطور فن، سیرت نگاری کا منظم آغاز پہلی صدی ہجری میں ہوا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: امولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ (م ۱۹۹۶ء)، تدوینِ سیر و مغازی (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۵ء)

سیرتِ محمدی ؐ کی تدوین ان علوم میں سے ایک ہے جن کو مسلمان اہلِ علم نے پوری احتیاط اور جانفشانی کے ساتھ مدوّن کیا۔ مسلم علماء محقّقین نے اپنی زندگیاں اس علم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ تاریخِ علوم میں کسی انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اتنی کثرت کے ساتھ نہیں لکھا گیا جتنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر لکھا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود عجائباتِ سیرت لامتناہی ہیں، سیرت کے کتنے ہی گوشے ہنوز پردۂ اخفاء میں ہیں اور محقّقین کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم ادبِ سیرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نگاروں نے روایاتِ سیرت کی جمع آوری پر زیادہ توجہ دی اور ان پر تنقیدی نظر کو مستقبل کے محقّقین پر چھوڑ دیا۔ اس حکمتِ عملی کا فائدہ یہ ہوا کہ سیرتِ نبوی پر لگ بھگ سارا مواد محفوظ ہو گیا، لیکن روایت اور درایت کے اصولوں کو پوری طرح بروئے کار نہ لانے کا نقصان یہ ہوا کہ ذخیرۂ سیرت میں کمزور اور موضوع روایات بھی داخل ہو گئیں۔ یہی روایات مستشرقین کی مرغوب غذا ہیں جن کو بنیاد بنا کر مغربی محقّقین نے سیرت پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ سترھویں صدی کے آغاز سے موجودہ دور تک سیرت پر مستشرقین کی جو کتب منصہ شہود پر آئیں ان میں انہی کمزور روایات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے مشہور مستشرق سر ولیم میور (م ۱۹۰۵ء) (Sir william Muir) کی کتاب "The Life of Muhammad" بڑی تہلکہ خیز ثابت ہوئی، اس کتاب میں مستشرق موصوف نے اپنے تئیں علمی انداز میں رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، اس کتاب کی پذیرائی نے مسلمان اہلِ علم کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ سر سید احمد خانؒ (م ۱۸۹۸ء)، وہ اوّلین شخص تھے جنہوں نے ۱۸۷۰ء میں ''خطباتِ احمدیہ'' میں مستشرق مذکور کے اعتراضات کا علمی اسلوب میں جواب دیا۔ سر سید کے اسلوبِ نگارش، طرزِ استدلال

اور واقعاتِ سیرت کی تنقید و تنقیح سے برّ صغیر میں سیرت نگاری کے ایک نئے رجحان نے جنم لیا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) نے سر سیدؒ کی روایت کو ایک منظم تحریک میں بدل دیا۔ علامہ موصوف نے سیرت نگاری میں غیر مستند مواد کو الگ کرنے کے لئے اپنی قابلِ قدر تصنیف ''سیرۃ النبیؐ'' کے مقدمے میں سیرت نگاری کے گیارہ اصول اور مآخذ بیان کئے [3]۔ علامہ شبلیؒ نے سیرت نگاری کے جو اصول و مبادی بیان کئے ہیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا ہے، ان سے اتفاق یا اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ علامہ شبلیؒ نے سیرت نگاری کے جن اصول و مبادی اور مآخذ و مصادر کا تعین کیا ہے، اس نے مابعد ادبِ سیرت پر اتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں کہ تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی سیرت نگار، علامہ موصوف کے اسلوبِ نگارش کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے۔ علامہ شبلیؒ نے سیرت نگاری کے جو اصول متعین کئے ہیں ان اصولوں پر محدّثین کے اصولوں کی گہری چھاپ ہے، روایاتِ سیرت کو محدّثین کی کڑی شرائط پر پرکھنا کس حد تک درست ہے یہ بہر حال ایک الگ بحث ہے، تاہم اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ روایاتِ سیرت کی جانچ پرکھ میں احتیاط کا رجحان پختہ ہوا۔ اس دور کی سیرت نگاری میں کئی پہلو قابلِ تنقید بھی ہیں، جن کی نشاندہی کرتے ہوئے عصر حاضر کے نامور محقّق اور دانشور ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ (م ۲۰۱۰ء) فرماتے ہیں:

''انیسویں صدی میں [سیرتِ نبوی پر] جو کام ہوا ہے، اس کا خاصہ حصّہ یا تو محض روایتی انداز کا ہے یا پھر معذرت خواہانہ ہے۔ قدیم انداز کی کتابوں میں تو صرف اصولِ روایت اور صحتِ سند پر ہی سارا زور ہے، اس کی اہمیت اور بنیادی حیثیت سے انکار نہیں ہے، لیکن بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کی گتھیوں کو اصولِ درایت اور اصولِ نقدِ تاریخی سے کام لئے بغیر سلجھایا نہیں جاسکتا۔ یہی حال جدید سیرت نگاروں کا ہے، انہوں نے، سب نے تو نہیں بہت سوں نے، مغربی معیارات کو ہی اصول قرار دیا اور غفلت پرستی کی رو میں معجزات کا عملاً انکار کیا۔ سر سیدؒ کے بارے میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تمام تر غیر معمولی عظمت کے باوجود ان کے کام میں ایسے مقامات بار بار آتے ہیں جن سے اتفاق کرنا دشوار ہے۔ ان کے ہاں کئی جگہ معذرت خواہانہ رویّہ ملتا ہے۔ بڑے بڑے مصنّفین کے ہاں معذرت خواہانہ رویّے ملتے ہیں۔ علامہ شبلیؒ کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے خود برّصغیر کے علماء نے تامّل کیا ہے

[3] علامہ شبلی نعمانی، **سیرۃ النبی**، (لاہور: الفیصل، 1991)، 4، 1:57۔

ʿAllama Shibli Nʿomāni, *Sīrat-al-Nabi* (Lahore: Al-Faiṣal, 1991), 4, 1:57.

۔بعض محتاط اور مستند علماء نے ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں معذرت خواہانہ رویّہ جھلکتا ہے۔یہ مغربی عروج کا زمانہ تھا، مسلمان مغربی طاقتوں کے براہِ راست قبضہ میں تھے اور ان کی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر تھے، اس کی چکا چوند سے آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔آج اس کیفیت میں کافی تبدیلی آئی ہے،آج خود مسلمان اہلِ علم میں ایسے فضلاء موجود ہیں اور کثرت سے موجود ہیں جو مغربی تصوّرات سے اتنے ہی واقف ہیں جتنا کوئی مغربی عالم ہو سکتا ہے۔اس لئے آج ہم ایک بہتر پوزیشن میں ہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اس معذرت خواہانہ ادب کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیں[4]۔''

سر سید احمد خانؒ اور علامہ شبلیؒ کے بعد جو ادبِ سیرت منصّۂ شہود پر آیا اس میں ایک بڑی تعداد ایسی کتب کی ہے جو یا تو براہِ راست مستشرقین کے ردّ میں لکھی گئیں یا پھر ان کتب کو مستشرقین کے اعتراضات،اشکالات اور سوالات کو مدِّ نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔'' ضیاء النبی ''(جلد ششم و ہشتم)از پیر محمد کرم شاہ الازہری (م ۱۹۹۸ء)، ''نبیٔ رحمت''از سید ابوالحسن علی ندوی(م۱۹۹۹ء)،''سید المرسلین''،(مترجم: کاظم جعفری)از ابو بکر سراج الدین (Martin lings،م ۲۰۰۵ء)،''ازواج مطہرات اور مستشرقین''از ظفر علی قریشی، ''مستشرقین اور مطالعہ سیرت'' از ڈاکٹر نثار احمد، ''اسلام ،پیغمبر اسلام اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر''از ڈاکٹر عبد القادر جیلانی (م ۱۹۹۲ء)،''اسوۂ کامل''از ڈاکٹر عبد الرؤف ظفر(م ۲۰۲۰ء)،''محمد رسول اللہ: مستشرقین کے خیالات کا تجزیہ'' از پروفیسر محمد اکرم طاہر (پ ۱۹۴۶ء)،''النبوۃ المحمدیۃ: و مفتریات المستشرقین''از محی الدین الالوائی، قابلِ ذکر ہیں ۔اسی طرح حافظ عبد الغفار کی مرتب کردہ کتاب،''سیرت النبی اور مستشرقین''، بھی اسی موضوع سے متعلق ہے ،اگرچہ یہ کتاب بنیادی طور پر دار المصنّفین اعظم گڑھ،انڈیا،سے شائع ہونے والے معروف علمی رسالے ''معارف'' کے شمارہ ۱۹۱۶ء تا ۲۰۱۴ء کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے۔''محمدؐ اور قرآن''(مترجم: ڈاکٹر مظہر محی الدین)از ڈاکٹر رفیق زکریا، یہ کتاب بھی بنیادی طور پر سلمان رشدی کے ناول "Satanic Verses" کا جواب ہے،تاہم اس میں مستشرقین کے اشکالات کو بھی مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ان سطور میں اس نوعیت کی کتبِ سیرت کا استقصاء مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ نشاندہی کرنا مقصد ہے کہ گذشتہ ایک عرصہ سے جو ادبِ سیرت تخلیق ہوا ہے اس کا پسِ منظر مغربی اسکالرز کے سیرت پر اعتراضات ہیں۔اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرتِ نبوی کو عصری

[4] غازی، ڈاکٹر محمود احمد، **محاضراتِ سیرت**(لاہور الفیصل، 1991)، 729-730۔

Ghāzi, Dr. Mahmūd Ahmed, *Muḥāḍrāt-e-Sīrat* (Lahore: Al-Faisal, 1991), 729-730.

تناظر میں نئے اصولوں پر مرتب کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان ممکنہ جہتوں کا ادراک بھی ضروری ہے جن پر تحقیقی اور تجزیاتی کام کی ضرورت عصر حاضر کا تقاضہ ہے۔

جہاں تک سیرت نگاری کے اصولوں کی بات ہے، اس حوالے سے علامہ شبلیؒ کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین ثانی کی کتاب ''اصولِ سیرت نگاری'' کے علاوہ اردو ادبِ سیرت میں کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی جس میں اصولِ سیرت نگاری کو باقائدہ موضوع بنایا گیا ہو، لیکن ڈاکٹر ثانی کی کتاب کی علمی قدر وقیمت کا اعتراف کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں بھی اصولِ سیرت نگاری کے نام پر فاضل مصنّف نے زیادہ گفتگو سیرت کے مصادر ومراجع پر ہی کی ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: از ڈاکٹر صلاح الدین ثانی، اصولِ سیرت نگاری (کراچی: مکتبہ یادگار شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی، ۱۴۲۴ھ) اس کتاب میں اگرچہ اصولِ سیرت نگاری کو باقائدہ موضوع بنایا گیا ہے، لیکن کتاب کے مندرجات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنّف نے سیرت نگاری کے جو پچیس اصول ذکر کئے ہیں وہ سیرت کے اصول نہیں بلکہ مصادر ومراجع زیادہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد جنید ندوی نے اپنے ایک تحقیقی مضمون بعنوان: ''سیرت نگاری کے مآخذ، اصول اور منہجِ تحقیق'' میں اصولِ سیرت نگاری کے لئے سر سید احمد خانؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، حکیم عبد الرؤف دانا پوریؒ اور محمد حسین ہیکلؒ وغیرہ جیسے اہلِ علم کے نقطۂ نظر کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا ہے، لیکن سیرت نگاری کے حوالے سے کسی نئے اصول کی نشاندہی نہیں کی[5]۔ اس سلسلے میں ایک تازہ کوشش میاں انعام الرحمن (پ ۱۹۷۰ء) نے کی ہے، فاضل مصنّف کی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ''سفرِ جمال'' اردو ادبِ سیرت میں ایک خوبصورت اور نادر اضافہ ہے۔ اس مختصر کتاب کا مقدمہ خاصے کی چیز ہے، جس میں فاضل مصنّف نے سیرت نگاری کے کئی اہم اصولوں کی نشان دہی کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اگر ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو سیرتِ نبوی کے آفاقی پہلو کی تفہیم ممکن ہے[6]۔ زیر نظر مقالے میں تمہیدی

---

[5] ندوی، ڈاکٹر محمد جنید، **سیرت نگاری کے مآخذ، اصول اور منہجِ تحقیق** (راولپنڈی: ضلال القرآن فاؤنڈیشن، 2007)، 45

Nadvi, Dr. Muhammad Junaid, *Sīrat Nigārī k Mākhaz, Uṣūl aūr Manhaj-e- Taḥqīq* (Rawalpindi: Dhalāl-al-Quran Foundation, 2007),45.

[6] میاں انعام الرحمن، **سفرِ جمال** (گوجرانوالہ: مطاف پبلی کیشنز، 2019)، 62-35۔

Mian Inām-ur-Reḥmān, *Safar-e-Jamāl* (Gujranwala: Maṭāf Publications, 2019), 35-62.

اور تعارفی کلمات کے بعد پہلے حصّے میں سیرت کے اصول و مبادی بیان کئے گئے ہیں، جبکہ مقالے کا آخری حصّہ سفارشات اور خلاصۂ بحث پر مبنی ہے۔

سیرت نگاری کے اصول ومبادی

رسالتِ محمدیؐ کی عصری معنویت اجاگر کرنے کے لئے نئے احوال و ظروف میں سیرت نگاری کی ضرورت ہے۔ سیرت نگاری کے اصولوں کے تعیّن میں حضرت عائشہؓ کے اس فرمان سے بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ جب آپؓ سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کے بارے میں سوال کیا گیا، توآپؓ نے فرمایا: "کانَ خُلُقُہُ القُرآن"[7] (آپؐ کا اخلاق قرآن ہے،) اس جملے میں اپنے اختصار کے باوجود معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے۔ حضرت عائشہؓ کے فرمان کے دیگر علمی پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے زیر بحث موضوع کی مناسبت سے یہ پہلو خصوصی توجہ کا متقاضی ہے کہ گویا حضور ﷺ کی زندگی جب قرآنِ مجید کی عملی تعبیر اور تفصیل ہے تو پھر مطالعاتِ سیرت کے لئے اصول بھی قرآنِ مجید سے اخذ کرنا ہی مناسب ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں حضرت عائشہؓ کے فرمان کو بنیاد بنا کر قرآنِ مجید کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید پر غور و فکر سے سیرت نگاری کے جو اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں ان میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:

ترتیبِ توقیفی

قرآنِ مجید کی جمع وتدوین اور ترتیب سے ہی ہمیں سیرت نگاری کے ایک اہم اصول کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کو ترتیبِ نزولی کے بجائے ترتیبِ توقیفی پر مدوّن کرنے کا حکم دیا۔

روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ پر ایک ہی وقت میں مختلف سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور ان سورتوں کے قلمبند کروانے کا طریقہ حضرت عثمانِ غنیؓ (م ۳۵ھ) کے بقول یہ تھا: "واذا نزلت علیہ الآیۃ، فیقول: ضعوا ھٰذہ الآیۃَ فی السورۃ التی یُذْکَرُ فیھا کذا وکذا۔" (i) "جب رسول اللہ (ﷺ) پر کوئی چیز نازل ہوتی توآپؐ (کاتبینِ وحی) سے فرماتے کہ اس آیت کو اس سورت میں لکھو جس میں فلاں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں۔" (i) ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، (م ۲۷۹ھ) جامع الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب و من سورۃ التوبۃ، ح: ۳۰۸۶، ص: ۶۹۵، (: الریاض: دار السلام، ۱۹۹۹ء)

[7] احمد بن حنبل، **المسند**، **مسند عائشہؓ**، (بیروت: عالم الکتاب، 1998)، 6:91۔

اور قرآنِ مجید کو زمان و مکاں کی قید سے ماوراء قرار دے کر اس کی آفاقیت کو بالکل نمایاں کر دیا، اور واضح کر دیا کہ یہ وہ کتاب ہے جو صرف اپنے شانِ نزول کی روایات اور مقامِ نزول کے ساتھ مقید نہیں، اور صرف عربوں کے لیے ہی نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کا پیغام آفاقی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کا اخلاق قرآن ہے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت نگاری میں اس اصول کو پیشِ نظر رکھنا، قرآنی فکر کا لازمی تقاضہ ہے۔ اگر اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو سوانح نگاری اور سیرت نگاری میں جو فرق ہے، وہ بالکل نمایاں ہو جائے گا۔ قرآنِ مجید نے مسلمانوں کے خدا کا تعارف ''رَبُّ الْعَالَمِيْن''[8] کی صفت سے کروایا ہے اور اپنا تعارف ''ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِيْن''[9] سے کروایا ہے، اور اگر سیرت نگاری میں اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو رسالتِ محمدی کا وہ آفاقی پہلو جسے قرآنِ مجید نے ''رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْن''[10] کہا ہے، کا صحیح معنوں میں ظہور ہو گا۔

شاید ابتدائی صدیوں کی سیرت نگاری میں یہ گوشہ دب جانے کی وجہ سے ہی یہ نامناسب تاثر پیدا ہوا کہ حضور ﷺ صرف عربوں کے نبی ہیں۔ غالباً اسی پس منظر میں ایران میں نقطوی تحریک کا ظہور ہوا جس کا نظریہ تھا کہ اسلام صرف ایک ہزار سال کے لیے تھا اور محمد (ﷺ) کی نبوت و رسالت آفاقی نہیں بلکہ صرف عربوں کے لیے تھی۔ اس تحریک نے برّ صغیر کو بھی بُری طرح متاثر کیا اور مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵ء) نے اسی تحریک کے زیرِ اثر ''دینِ الٰہی'' کی بنیاد رکھی جس کے ردِ عمل میں حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۳۔۱۶۲۴ء) کی عظیم دعوتی تحریک کا ظہور ہوا۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''تحریکِ نقطوی اور دینِ الٰہی پر اس کے اثرات'' ماہنامہ معارف، انڈیا ۱۷۰: ۱ (جولائی ۲۰۰۲)

اس لیے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت نگاری میں آفاقی رنگ اس وقت ہی نمایاں ہو گا، جب اس کو قرآنِ مجید کی طرح زمان و مکاں کی قید سے ماوراء سمجھ کر مدوّن کیا جائے۔ اس سے رسالتِ محمدی کی آفاقیت اور

[8] الفاتحہ، 1:1
Al-Fātiḥa, 1: 1.
[9] یوسف، 12:104
Yūsuf, 12: 104.
[10] الانبیاء، 21:108

عالمگیریت کا پیغام واضح ہوگا اور یہ حقیقت بھی عیاں ہوگی کہ تذکرۂ سیرت پوری انسانیت کے لیے ہے نہ کہ صرف عربوں اور مسلمانوں کے لیے۔

پیغام کی مرکزیت

سیرت نگاری کا دوسرا اصول قرآنِ مجید میں سابقہ انبیاء کرامؑ کی سیرت کا گہرے تدبّر سے مطالعہ کرتے ہوئے نمایاں ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید نے انبیاء کرامؑ کی سیرت نگاری میں نبوت ورسالت کے مرکزی پیغام کو کسی بھی جگہ پر متاثر نہیں ہونے دیا۔ قرآنِ مجید نے بعض انبیاء کرام کا ایک سے زائد مقامات پر تذکرہ کیا ہے لیکن تمام مقامات پر نبی کے پیغام کی مرکزیت پوری طرح نمایاں رہی ہے۔ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا بنیادی مقصد معاشرے کی اخلاقی تطہیر ہے، اس لیے انبیاء کرامؑ کی سیرت میں دعوتی اور تذکیری پہلو بہت نمایاں ہے۔ اس حوالے سے حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور دیگر انبیاء کرامؑ کی زندگیوں کا قرآنِ مجید کی روشنی میں مطالعہ بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ مجید میں انبیاء کرامؑ کی سیرت سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو بھی اس انداز سے بیان کیا جائے کہ آپؐ کی زندگی کا دعوتی اور تذکیری پہلو نمایاں ہو اور کسی بھی جگہ پیغامِ محمدی کی روح متاثر نہ ہونے پائے۔ سیرت نگاری میں معجزات اور شمائل وفضائل کا تذکرہ اس پہلو سے اہم ہے کہ اس اسلوبِ نگارش سے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کی محبت موجزن ہوتی ہے، لیکن معجزات اور شمائل وفضائل کا اس انداز میں تذکرہ درست نہیں ہوگا کہ مخاطب رسول اللہ ﷺ کو محض ایک دیومالائی شخصیت سمجھنے لگے کہ جس کی اطاعت اور اتباع ممکن ہی نہیں اور لوگ نجات کے لئے ان پر محض ایمان کو کافی سمجھنے لگیں۔ اس نوعیت کی سیرت نگاری کے اثرات مسلمانوں کی بے عملی کی صورت میں نکلیں گے ،لہٰذا سیرت نگار کے لئے لازم ہے کہ وہ سیرتِ نبوی کو اس انداز میں نمایاں کرے کہ آپؐ کی ذات ایک قابلِ تقلید نمونہ آئے۔ عمومی طور پر ہمارے ہاں سیرت نگاری میں فضائل وکمالات کا تذکرہ اس اسلوب میں کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کی فضیلت اور شان تو بے شک نمایاں ہوتی ہے، لیکن اس میں قارئین کے لیے کوئی عملی پیغام عام طور پر موجود نہیں ہوتا۔

یہی حال ان کتابوں کا بھی ہے جو محض معلوماتِ سیرت (Database) پر مبنی ہیں۔ اس نوعیت کی سیرت نگاری کی جزوی افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں چونکہ رسالتِ محمدی کا مرکزی پیغام پیشِ

نظر نہیں ہوتا لہٰذا سیرت کا انقلابی پہلو پردۂ اخفاء میں ہی رہتا ہے۔ سید ابوالحسن علی ندویؒ (م ۱۹۹۹ء) کو اس حقیقت کا مکمل ادراک تھا، آپؒ لکھتے ہیں:

> "اس موضوع [سیرت] پر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں قدیم اور جدید دونوں قسم کے مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو، دوسری طرف سیرت کے اوّلین اور اصل (Original) مآخذ پر اس کی بنیاد ہو، اور قرآن و حدیث سے اس میں سرموانحراف نہ کیا گیا ہو۔ وہ موسوعی (Encyclopaedic) طرز پر نہ لکھی گئی ہو، جس میں سارے معلومات بغیر نقد و تمحیص کے بھر دئے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ طرزِ تصنیف اور اسلوبِ تحریر ہے جس کے دورِ آخر کے اکثر مصنّفین اور بعض متقدّمین بھی عادی رہے ہیں۔ یہ طرز بہت سے ایسے غیر ضروری اشکالات اور سوالات پیدا کرتا ہے جن سے سیرتِ نبوی بری اور بے داغ ہے[11]۔"

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اصل سیرت نگاری یہ ہو گی کہ رسول اللہ ﷺ کو مافوق الفطرت شخصیت ثابت کرنے کے بجائے ایک قابلِ نمونہ انسان کے طور پر متعارف کروایا جائے جس کی اتباع کرنا ہر انسان کے لئے ممکن اور آسان ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد معاشرے کی اخلاقی تطہیر ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق معاشرت، معیشت، سیاست یا دیگر معاملاتِ زندگی سے ہو، کے اخلاقی پہلوؤں کو نمایاں کرنا ہی اصل سیرت نگاری ہو گی۔

دروس و عبر

قرآنِ مجید نے ایک ہی نبی کی سیرت کو مختلف سورتوں میں بیان کیا ہے اور ہر جگہ ان کی سیرت کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کیا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے انبیاء کرامؑ کی سیرت میں دروس و عبر کے پہلو کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ تاریخی واقعات اور انبیاء کرامؑ کے تذکرۂ سیرت میں قرآنِ مجید نے جزئیات نگاری کی حوصلہ شکنی کر کے دروس و عبر اور واقعات کے تذکیری اور دعوتی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآنِ مجید نے اصحابِ

---

[11] ندوی، سید ابوالحسن علی، **نبیٔ رحمت** (کراچی: مجلسِ نشریاتِ اسلام، 1978)، 23

Nadavī, Syed Abū Al-Ḥassan Ali, *Nabi Raḥmat* (Karachi: Majlis Nashrīyāt Islām, 1978), 23.

کہف کے واقعہ کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے، چونکہ اس واقعے کا بنیادی مقصد لوگوں کے دل میں مرنے کے بعد جی اٹھنے کے عقیدے کا احیاء تھا اس لئے قرآنِ مجید نے جزئیات نگاری کا کوئی ایسا اسلوب اختیار کرنے سے مکمل اجتناب کیا ہے جس سے لوگوں کی توجہ دعوتی اور تذکیری پہلو سے ہٹ جائے اور اگر کچھ لوگوں نے اصحابِ کہف کی تعداد معلوم کرنا چاہی کہ یہ لوگ تعداد میں کتنے تھے؟ اور ان کی زندگی کی دیگر تفصیلات کیا تھیں؟ تو قرآنِ مجید نے ان کے سوالات کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا اور واقعے کے تذکیری اور دعوتی پہلو کو ہی نمایاں کیا ہے۔ یہی معاملہ سورۂ یوسف کا ہے کہ قرآنِ مجید نے حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں افراد اور قوموں کے لئے عروج وزوال کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ کہ مسلمان جب اس سورت کو بغور پڑھیں گے تو وہ نہ صرف تدبیر اور تقدیر کے فرق کو سمجھ جائیں گے بلکہ اس سورت کے آئینے میں اپنے مستقبل کو بھی دیکھ لیں گے۔ اب اگر کوئی شخص جزئیات نگاری کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے اس پوری سورت میں حضرت یوسفؑ اور عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) کی ملاقات والے جزوی حصّے کو ایک عشقیہ داستان بنانے کی جسارت کرے اور سورت کے دروس و عبر کے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دے تو بہر حال قرآنِ مجید اس طرح کی خرافات اور یاوہ گوئی سے بالکل اجنبی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرت نگاری میں قرآنِ مجید کے اسلوبِ نگارش کو بطور اصول اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دورِ حاضر میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں جزئیات نگاری ایک جدید اور قابل قدر رجحان ہے۔ اس وقت محقّقین کا ایک بڑا طبقہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے انفرادی پہلوؤں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں، مثلاً طبّ نبویؐ، رسول اکرمؐ کی جنگی حکمتِ عملی، رسولِ اکرمؐ بطور معلّم، رسول اللہؐ بطور ماہرِ نفسیات، نبی اکرمؐ بطور تاجر، وغیرہ اور اس سے ملتے جلتے موضوعات پر کثرت کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ سیرتِ نبوی کے بیان میں جزئیات نگاری کا اسلوب قابلِ تعریف ہے، اس نوعیت کی سیرت نگاری میں ہمیں قرآنِ مجید سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جزئیات نگاری ہیں وہ تمام امور جن کا تعلق انسانی تدبیر، تجربات اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ہے، ان کا سیرت کے ساتھ تقابلی مطالعہ کئی حوالوں سے احتیاط کا متقاضی ہے۔ مثلاً بطور جرنیل حضور ﷺ کی جہادی زندگی اور حکمتِ عملی پر لکھتے ہوئے جنگی اخلاقیات پر مبنی تعلیمات کو نمایاں کرنا اصل سیرت نگاری ہوگی نہ کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقِ جنگ سے جدید جنگی حکمتِ عملی کا تقابلی جائزہ، اس لئے کہ آپؐ جنگ کے طریقے سکھانے نہیں بلکہ انسانوں کی ہدایت اور اخلاقی تطہیر کے لئے تشریف لائے تھے۔ ہاں اگر سیرت کے اس پہلو کا جنگی اخلاقیات کے بین الاقوامی قانون (International Humantiarn Law) سے

کیا جائے تو یہ بالکل درست ہو گا، اس لیے کہ آپؐ نے ہی انسانوں کو یہ شعور دیا کہ عین حالتِ جنگ میں بھی دوسرے انسانوں کے حقوق ساقط نہیں ہوتے بلکہ ان کی پاسداری ہی انسانیت کا اصل جوہر ہے۔

پیغمبر ﷺ کی زندگی پر بطور تاجر لکھتے ہوئے کاروباری اخلاقیات (Business Ethics) کے پہلو کو واضح کرنا، اصل سیرت نگاری ہو گی نہ کہ محض آپؐ کی کاروباری زندگی کے احوال و آثار کی تاریخ کو بیان کر دیا جائے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں کاروبار کی تمام شکلوں کو سیرتِ نبوی سے ثابت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، بلکہ اس حوالے سے درست رویہ یہ ہو گا کہ اسلامی نظامِ معیشت میں جس طرح انسانی معاشرے کے مجموعی مفادات اور خیر خواہی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اس کو سیرتِ طیّبہ کی روشنی میں واضح کیا جائے کہ اسلام کے معاشی نظام میں خاص افراد یا طبقات کے بجائے مجموعی انسانی معاشرے کے مفادات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ سیرت نگاری کے اس اسلوب سے مغربی نظامِ معیشت میں ارتکازِ دولت، خود غرضی اور مارکیٹنگ کی نفسیات کا بھیانک چہرہ خود بخود بے نقاب ہو جائے گا اور اسلامی نظام معیشت کا اصل فلسفہ اور جوہر نمایاں ہو گا۔ ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کی وہ تمام احادیث جن کا تعلق طبّ سے ہے اور جن میں آپؐ کے تعلیم کردہ طریقہ سے لوگوں کے صحت یاب ہونے کا تذکرہ ہے، اس نوعیت کے واقعات کو رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اس نوعیت کی سیرت نگاری میں طبّی اخلاقیات کو اجاگر کرنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد انسانوں کے روحانی امراض کا علاج تھا نہ کہ آپؐ لوگوں کے جسمانی امراض کے علاج معالجے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اگر آپؐ کے تعلیم کردہ طریقۂ علاج سے کسی مریض کا شفاء یاب ہونا ثابت ہے تو یہ آپؐ کا معجزہ ہے اور شواہدِ نبوت میں شمار کرنے کے لائق ہے، اور اگر آج بھی کوئی شخص اس طریقۂ علاج کو اختیار کرتا ہے اور اس کی برکت پر یقین رکھتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ اس کی رسالت مآبؐ سے والہانہ محبت و عقیدت کا ثبوت ہو گا۔ لیکن ''طبِّ نبوی'' کے عنوان سے اس طرح کی روایات کا جدید میڈیکل سائنس سے تقابل کا جو رجحان فروغ پذیر ہے وہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس طرز کی سیرت نگاری پر کئی طرح کے سنجیدہ سوالات پیدا ہونا ایک فطری عمل ہو گا۔ یہ حقیقت بھی قابلِ ذکر ہے کہ طبِّ نبوی کے عنوان کے ساتھ جو روایات حدیث و سیرت کی مختلف کتب میں ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر آئمہ جرح و تعدیل کے ہاں ضعیف اور ناقابلِ استناد ہیں۔

ایک داعی اور استاد کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ آپؐ کا اپنا فرمان ہے: ''وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا[12]'' بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ لیکن تعلیمی میدان میں طویل تہذیبی اور تمدنی تجربات کے بعد حاصل ہونے والے نتائج اور جدید اصطلاحات سے سیرتِ طیّبہ کا اس انداز میں تقابل درست نہیں ہوگا کہ ہر چیز کو کھینچ تان کر سیرت سے ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ بعض محقّقین اس کوشش میں نظر آتے ہیں کہ معروف مغربی ماہرینِ تعلیم کے تعلیمی نظریات اور ان کے متعارف کروائے گئے نظامِ تعلیم کا سیرتِ نبوی کے ساتھ اس انداز میں تقابل کیا جائے کہ سیرتِ طیّبہ کی برتری ثابت کر دی جائے۔ یہ تقابل اگر ضروری ہو تو اس کا اسلوب ایسا ہونا چاہیے کہ مغربی نظامِ تعلیم کے سیرت سے تقابل میں کسی کمی کا احساس پیدا نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ تبھی ممکن ہے جب اس نوعیت کی سیرت نگاری میں ہمارے پیشِ نظر اسلام کا فلسفۂ تعلیم اور تعلیم و تعلّم کے آداب ہوں گے۔ تحقیق و جستجو میں جزئیات نگاری کس طرح منزل سے دور کر دیتی ہے اس کی ایک دلچسپ مثال قرآنِ مجید کی سائنسی تفسیر کا رجحان ہے۔

معروف مستشرق ڈاکٹر موریس بوکائے (م ۱۹۸۴ء) نے قرآن مجید اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد جب اپنی معروف کتاب "The Bible, The Quran and Science" مرتب کی تو چونکہ موصوف علوم القرآن پر گہری نظر نہ رکھتے تھے اور محض ایک سائنسدان اور ڈاکٹر ہی تھے، اس لیے اپنی تحقیق میں قرآنِ مجید کے موضوع اور اس کے نزول کے حقیقی مقصد کو پیش نظر نہ رکھ سکے۔ فاضل مصنّف نے تمام سائنسی حقائق کو قرآنِ مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش انتہائی اخلاص پر مبنی تھی اور اس کتاب کی اشاعت سے قرآنِ مجید اور اسلام کی حقانیت کے بعض ایسے پہلو نمایاں ہوئے جو پردہ اخفاء میں تھے، اس فکر انگیز کتاب نے مغربی اہلِ علم کو اسلام کے بارے زیادہ سنجیدگی سے سوچنے کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر موریس بوکائے کی اس تحقیق کے نتیجہ میں تفسیری ادب میں ''بوکائے ازم'' کی صورت میں قرآنِ مجید کی سائنسی تعبیر و تشریح کے ایک نئے رجحان نے جنم لیا۔ اس رجحان کے جزوی فوائد سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ حق ہے کہ نزولِ قرآن کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ اس سے سائنسی حقائق کو ثابت کیا جائے یا سائنسی حقائق کی سچائی کو قرآنِ مجید کی روشنی میں پرکھا جائے۔ قرآنِ مجید کا موضوع انسان ہے اور اس کا مقصدِ نزول انسان کی ہدایت ہے۔ لہٰذا قرآنِ مجید کا مطالعہ اسی تناظر میں کرنا چاہیے، ورنہ لوگ قرآنِ مجید کو فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی کتاب بنا کر رکھ دیں گے اور قرآنِ مجید کا اصل پیغام دب جائے گا۔

---

[12] ابن ماجہ، محمد بن یزید، **سنن ابن ماجہ** (الریاض: دارالسلام، 1999)، 1:1-10-11۔
Ibn Māja, Muḥammad Bin Yazīd,Sunan Ibn Māja(Al-Riyadh, Dar al-Salam,1999), 1: 10-11.

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ان گزارشات کا مقصد اور ہدف سیر طیّبہ کی ترویج واشاعت میں جزئیات نگاری کی مخالفت نہیں ہے بلکہ صرف یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ اسلوبِ تحریر میں فلسفۂ سیرت نظروں سے اجھل نہ ہونے پائے۔ یہی وہ تناظر ہے جس میں قرآن مجید نے رسول اکرمؐ کی زندگی کو ''أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' قرار دیا ہے نہ کہ ''أُسْوَةٌ كَامِلَةٌ''۔ اسوۂ حسنہ میں آفاقیت ہے اور اس کا ظہور مسلسل ہو رہا ہے، بشرطیکہ سیرت نگاری بیں گہرے تدبر، تفکر اور تعقل کو حرزِ جاں بنایا جائے۔

مقصدیت

عربوں کو اپنی زبان دانی پر بڑا فخر تھا۔ عرب شعراء نے فنِ شاعری اور خطباء نے مقفّع و مسجّع گفتگو اور نثر نگاری کو نقطۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، وہ اپنے مقابلے میں پوری دنیا کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے۔ قرآنِ مجید عرب شعراء اور خطباء دونوں کے لیے چیلنج کے طور پر نازل ہوا۔ فصحائے عرب کو اعتراف کرنا پڑا کہ قرآن نہ تو شاعری ہے اور نہ ہی محض مقفّع و مسجّع نثر نگاری، بلکہ قرآن صرف قرآن ہے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جداگانہ صنف ہے۔ قرآنِ مجید نے عربوں کو اس بحث میں پڑنے ہی نہیں دیا کہ وہ قرآنِ مجید کو فنّ شاعری اور نثر کے اصولوں پر ہی پرکھنے کے چکر میں پڑے رہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے اسلوب کو عربوں کے لیے چیلنج تو ضرور قرار دیا لیکن اپنی دعوت پر اس نئے اور منفرد اسلوب کو بھی غالب نہیں آنے دیا۔ گویا قرآنی فکر کا حاصل یہ ہے کہ فنّ ہمیشہ فکر اور مقصد کے تابع رہے گا۔ قرآنِ مجید پر اس پہلو سے غور کرنے سے سیرت نگاری کا یہ اصول نمایاں ہوتا ہے کہ فن کو سیرت کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ مخدوم، اگر غلبہ فن کو حاصل ہو گا تو فن کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے سیرت سے وابستہ بعض حقائق تشنہ رہ جائیں گے، اور سیرت کے پیغام کی روح اور اس سے چھلکتی تاثیر اور مقصدیت ہم سے غیر محسوس انداز میں چھنتی چلی جائے گی۔ اس نقطۂ نظر کی ایک مثال مولانا محمد ولی رازی (پ ۱۹۳۵ء) کی سیرت پر غیر منقوط کتاب ''ہادی عالم'' ہے۔ یہ کتاب رسول اللہ ﷺ سے محبت کا اظہار تو کہی جاسکتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کتاب میں سیرت کے کن انقلابی پہلوؤں اور نئے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے؟ یہ فن کی خدمت تو ضرور ہے، لیکن اس کو سیرت کی خدمت کہنا محلِ نظر ہے۔ اور پھر اس نوعیت کی سیرت نگاری پر اہم سوال یہ ہے کہ کیا سیرت کا متحرک پہلو ختم ہو گیا ہے؟ اس قسم کی ''علمی خدمات'' اس وقت منصّۂ شہود پر آتی ہیں جب انسان کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ بچے، جبکہ سیرت کے معاملے میں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ سیرت کے عجائبات لامتناہی ہیں اور وہ محقّقین کو ہمیشہ اپنی

طرف متوجہ کرتے رہیں گے۔ سیرت نگار کو ہر لمحہ عجائباتِ سیرت کی کھوج میں رہنا چاہیے، اور سیرت نگاری کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ماضی میں اس کی ایک مثال ہمیں ابوالفضل فیضی (م ۱۵۹۵ء) کی تفسیر ''سواطع الالہام'' کی صورت میں نظر آتی ہے جو قرآنِ مجید کی غیر منقوط تفسیر ہے۔ ہمارے علم میں ایسا ایک بھی حوالہ نہیں جس میں کسی محقّق نے تفسیری نکات کی وضاحت کے لیے اس تفسیر سے استدلال کیا ہو، گویا علمی اعتبار سے اس تفسیر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ پھر یہ فن کی خدمت شمار ہو گی، قرآنِ مجید کی خدمت کیسے ہو گئی؟ مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس طرح کے لطائف ہماری علمی تاریخ کا حصہ رہے ہیں کہ ایک شخص کسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھتا، پھر خود ہی ''اختصار نویسی'' کے فن کے اظہار کے لیے اس کا اختصار لکھتا، اور پھر خود ہی اس کی شرح لکھنے بیٹھ جاتا۔ درس نظامی کے نصاب میں فقہ کی کتاب۔''کنزالد قائق۔''، ''الہدایہ''، اور علم نحو کی کتاب ''الکافیہ'' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

سیرت نگاری میں مقصدیت کو اُجاگر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن و حدیث کی طرح روایاتِ سیرت کو بھی شریعت کے بنیادی مصادر میں شمار کرتے ہوئے استدلال کی بنیاد بنایا جائے۔ سیرت نگاری میں اس وقت ''فقہ السیرہ'' کے عنوان کے ساتھ جو رجحان فروغ پذیر ہے، اس کو ایک منظم تحریک کی شکل دی جائے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالٰی نے اپنے تکوینی نظام کے مطابق مختلف افراد اور گروہوں سے دین کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کا کام لیا۔ محدّثین اور ائمۂ جرح و تعدیل نے متون کی حفاظت کا کارنامہ اس انداز میں انجام دیا کہ تاریخِ علوم میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ فقہاء کرامؒ نے اس متن کو بنیاد بنا کر دینِ اسلام کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور ثابت کیا کہ دینِ اسلام صرف آخرت ہی نہیں بلکہ دنیوی کامیابی کا بھی ضامن ہے، صوفیہ کرامؒ نے تزکیۂ نفس کے عنوان سے دین کے روحانی پہلو کو اجاگر کیا، خدمتِ خلق اور ذاتی کردار سے مخلوقِ خدا کو ایمان کی دولت سے آشنا کر کے ان کی روحانی تسکین کا سامان کیا۔ سیرت نگاروں نے اپنے اصولوں اور شرائط پر رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ سے متعلق روایات کو جمع کیا، پوری امت کی طرف سے یہ لوگ شکریہ کے مستحق ہیں کہ جن کی بدولت آج پیغمبرؐ کی زندگی کا ہر پہلو کھلی کتاب کی طرح ہے، گویا نسلِ انسانی حضور اکرم ﷺ کو اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھ رہی ہے۔ دینِ اسلام کے تحفظ اور ترویج و اشاعت میں محدّثین، فقہاء، صوفیہ اور سیرت نگار، چاروں طبقات کا کردار آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ باقی طبقات کی طرح سیرت نگاروں پر لازم ہے کہ وہ سیرتِ طیّبہ کو محض اظہارِ فن کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ سیرتِ نبوی کی مقصدیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے نت نئے گوشوں کو عصری تناظر میں اجاگر کریں۔

پسِ منظر اور اسباب وعِلل

قرآنِ مجید نے تاریخِ نبوت ورسالت سے تعلق رکھنے والے مختلف واقعات کے اسباب، نتائج اور اثرات کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ سیرت نگاری میں قرآنِ مجید کا یہ اسلوب بطور اصول اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ قدیم سیرت نگار اکثر واقعاتِ سیرت کے اسباب وعلل سے زیادہ بحث نہیں کرتے۔ مثلاً غزوات وسرایا کے بیان میں عام طور پر یہی درج ہوتا ہے کہ فلاں وقت فلاں قبیلہ کی طرف فوج بھیجی گئی یا فلاں واقعہ فلاں دور میں ہوا۔ زمان و مکاں کی رعایت کرتے ہوئے واقعات کو ترتیب دینا سوانح نگاری اور واقعات نگاری کا روایتی اسلوب ہے، لیکن اس نوع کی سیرت نگاری کے نتیجے میں مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ مختلف واقعات کا اپنی غرض سے کوئی سبب دریافت کریں۔ یہاں بطور مثال منٹگمری واٹ (W.Montgomery Watt) کی کتابوں "Muhammad at Mecca" اور "Muhammad at Medina" کا تذکرہ مفید ہوگا، کیونکہ مستشرق مذکور اور ان کی محولہ بالا کتب اسلامی حلقوں میں کافی معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ اپنی ان تصانیف میں منٹگمری واٹ نے واقعاتِ سیرت کے اسباب کو اپنی اغراض سے تراشنے کی کوشش کی ہے اور غیر جانبداری کے لباس میں سیرتِ نبوی پر اعتراضات کے مواقع پیدا کیے ہیں۔

منٹگمری واٹ (م ۲۰۰۶ء) (W.Montgomery Watt) نے اپنی کتاب "محمدؐ ایٹ مکہ" کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی پسِ منظر پر گفتگو کی ہے اور اسلامی تعلیمات کی سحر انگیزی کی بجائے عربوں میں اسلام کی مقبولیت کے عجیب وغریب اسباب بیان کئے ہیں اور پھر عربوں کی اقتصادی کسمپرسی کو بیان کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے:

"It was hunger that drove the Arbs along the road of conquest."(i)

"یہ بھوک تھی جس نے عربوں کو فتوحات کے راستے پر ڈال دیا۔"

مستشرق مذکور نے اپنی کتاب "محمدؐ ایٹ مدینہ" میں اسلام کے فلسفۂ جہاد کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہجرت کے بعد مختلف جنگی مہمات عرب کلچر کے مطابق لوٹ مار کی ایک شکل تھیں، اور ایسی مہمات مالِ غنیمت کے حصول کا بڑا ذریعہ تھیں، چنانچہ موصوف لکھتا ہے:

"As these expenditions, even that to Bader, was razzias,where the aim was to capture booty without undue danger to oneself."(ii)

"یہ مہمات وغزوات جیسا کہ جنگ بدر، جن کا مقصد اپنے آپ کو حد سے زیادہ خطرے میں ڈالے بغیر محض مالِ غنیمت کا حصول تھا۔"

(i)"Muhammad at Mecca" (Karachi:Oxford University Press, 2000) 3

(ii)"Muhammad at Medina" (Karachi:Oxford University Press, 2006) 231

یہی حال دیگر مستشرقین کا بھی ہے، لہٰذا سیرت نگاری میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مختلف واقعات کے اسباب و علل کیا تھے؟ سید ابو الحسن علی ندویؒ سیرت نگار وں کے لئے اس اہم اصول کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی جو سطح تھی اس سے باخبر ہو، نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات، اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت سے واقف ہو، تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج وافتادِ طبع، ان کے ذہن و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے، اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث و سیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گذرتے ہیں اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جا سکتے جب تک مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت، اس کے جغرافیہ، اس کے گرد و نواح، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات و روابط، معاہدوں اور عہد ناموں، اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور قومی و ملکی دستور اور رسم رواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے ناواقف ہو کر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک سرنگ میں چلنے والے کی سی ہو گی جس کو اپنے دائیں بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو[13]۔''

جس طرح بعض آیاتِ قرآنی کی تفہیم کے لئے شانِ نزول کی روایات کی اہمیت مسلّمہ ہے اسی طرح روایاتِ سیرت کی تفہیم کے لئے پسِ منظر اور اسباب و علل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً: رسول اللہ ﷺ نے مشہور یہودی سردار کعب بن اشرف (م ۳ھ)، سَلّامُ ابنُ اَبِی الحُقَیق (م ۴ھ) اور دیگر سردارانِ یہود کو گوریلا کارروائیوں کے ذریعے قتل کروا دیا تھا۔ کیا آپؐ اپنے مخالفین کو اسی انداز میں قتل کروا دیا کرتے تھے؟ جیسا کہ بعض مستشرقین کا دعویٰ ہے۔

[13] ندوی، نبیٔ رحمت، 1:14-15۔

Nadavī, , *Nabi Raḥmat*,1: 14-15.

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (م ۱۹۹۸ھ) نے اس موضوع کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور مستشرقین کے تمام اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ان اعتراضات کی سطحیت کو واضح کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ''ضیاء النبیؐ''، ج: ۷، (لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۱۸ھ)، مجلدات: ۷، ص: ۵۲۵۔۵۹۴

ظاہر ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے تو پھر اس فردِ جرم کا تفصیلی بیان اور تجزیہ ضروری ہے جس کی بنیاد پر آپؐ نے اس کارروائی کا حکم صادر فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے محض تئیس سال کے عرصہ میں انقلاب برپا کر دیا۔ کیا مقامی اور عالمی حالات کی ہمواری ہی آپؐ کی کامیابی کا واحد سبب تھا؟ جیسا کہ بعض مستشرقین نے کہا ہے[14]۔

تفصیل لے لئے منٹگمری واٹ کی محولہ بالا کتب کے علاوہ "Muhammad Prophet and Statesman" ملاحظہ فرمائیں۔ سر ولیم میور نے بھی اپنی کتاب "Muhammad and Islam" میں یہی رائے اختیار کی ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ایسے حوالہ کا استقصاء نہیں ہے ورنہ ان کے علاوہ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد کا بھی یہی مؤقف ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو صادق اور امین تسلیم کرنے کے باوجود اہلِ مکہ اور جزیرۂ عرب کے اکثر قبائل مسلمان نہیں ہوئے اور پھر یکدم فتحِ مکہ کے ساتھ تمام قبائل مسلمان ہوگئے۔ اہلِ مکہ اور قبائلِ عرب کے اسلام قبول نہ کرنے کے داخلی اور خارجی اسباب کیا تھے؟ اس مقصد کے لئے عرب تہذیب کا تنقیدی مطالعہ اور عربوں کے مزاج اور رویوں پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تجزیہ لازم ہے۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ تحقیق و جستجو میں سیاق وسباق (Context) انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، سیاق و سباق قومی، علاقائی اور عالمی کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور سیرت نگار ان میں سے کسی بھی چیز کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

تنقیدی رویہ

تنقیدی رویے (Critical Approach) سے مراد یہ ہے کہ سیرت سے متعلق مختلف واقعات اور روایات کا تنقیدی مطالعہ اس انداز میں کیا جائے کہ ان واقعات اور روایات کے معروف اور ظاہری مفہوم کے علاوہ دیگر امکانات کو بھی زیرِ غور لایا جاسکے۔ سیرت نگاری کے اس اصول کی بنیاد وہ تمام آیات ہیں جن میں اللہ رب العزت نے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے بار بار تدبر، تفکر اور تعقل کی دعوت دی ہے۔ اس اصول کی اہمیت کو چند مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً عام طور پر مشہور ہے کہ ہجرتِ حبشہ کفارِ مکہ کے مظالم سے بچنے کے لئے ہوئی، ایک حد تک یہ بات درست ہے، لیکن اگر ہجرتِ حبشہ کے پورے واقعہ کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو کئی اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت بلال حبشیؓ (م ۲۰ھ) حضرت عمار بن یاسرؓ (م ۳۷ھ) مکہ کے مظلومین میں شامل تھے

اور آزاد بھی ہو چکے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ اس کے برعکس بعض ایسے صحابہ کرامؓ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے جن کو مکہ میں سرداری کا مقام حاصل تھا۔ ایسے لوگوں میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ (م ۸ھ)، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ (م ۳۲ھ)، حضرت عثمان بن عفانؓ (م ۳۵ھ)، حضرت زبیر بن العوامؓ (م ۳۶ھ)، حضرت حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہؓ (م ۱۱ھ)، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ (م ۱۳ھ)، حضرت عیاش بن ابی ربیعہؓ (م ۱۳ھ)، حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ (م ۱۸ھ) قابلِ ذکر ہیں۔ اس تجزیے سے یہ رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے کہ یہ ہجرت محض کفارِ مکہ کے ظلم سے بچنے کے لئے نہ تھی بلکہ اس میں بیک وقت کئی مقاصد پیشِ ہو سکتے ہیں۔ ایک، عرب سے باہر دعوت کے امکانات اور دعوتی سرگرمیاں منظم کرنا، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں اہلِ حبشہ کی کافی تعداد مسلمان ہو گئی تھے[15]۔ دوسرا، سرزمینِ حبشہ کا دار الہجرت کے طور پر جائزہ لینا کہ اگر مکہ میں مسلمانوں کے لئے رہنا ناممکن ہو جائے تو کیا سرزمینِ حبشہ متبادل جائے پناہ ہو سکتی ہے؟ اس تجزیے کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ مہاجرینِ حبشہ میں بعض حضرات ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے اہلِ خانہ سمیت ہجرت کی۔ تیسرا، ہجرتِ حبشہ سے متعلق روایات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ایسے اصحاب کو خصوصی طور پر مہاجرین میں شامل کیا گیا جو بھرپور قائدانہ صلاحیتیں رکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف حبشہ کی اعلیٰ ترین قیادت سے دعوتی اور سیاسی ہر طرح کی گفتگو کا اختیار رکھتے تھے۔ اس حوالے سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی نجاشی کے دربار میں کی گئی گفتگو کو دیکھا جا سکتا ہے[16]، اور اسی طرح نجاشی سے گفتگو کے لئے حضرت عمرو بن امیہ الضمریؓ کے انتخاب کی حکمت بھی سمجھ آتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ (م ۲۳ھ) کے قبولِ اسلام کا معروف واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک دن (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلے، راستے میں کسی نے خبر دی کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں، چنانچہ وہ غصے میں اپنی بہن فاطمہ بنت خطابؓ کے گھر پہنچے، اور بہن سمیت وہاں موجود لوگوں کی خوب

---

[15] ڈاکٹر محمد حمید اللہ، **مجموعہ الوثائق** (قاہرہ، 1941ء)، 49۔

Dr. Muhammad Hamīdullah, *Majmūaḥ Al-Wathāiq* (Qāḥiraḥ:1941), 49.

[16] ابن ہشام، **السیرۃ النبویۃ** (بیروت: دار الفکر، ۱۹۹۸ء)، ۴۱: ۲۵۵۔

Ibn-e-Ḥishām, *Al-Sīra Al-Nabawiyya*(Beīrūt: Dār Al-Fikr,1990 AH), *41*:*255.*

پٹائی کی اور ان کو لہو لوہان کر دیا، اور ان کو اسلام سے منع کر دیا لیکن بہن نے پوری جرات سے ان کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ اب غصہ کچھ کم ہوا تو تقاضہ کیا کہ مجھے بھی وہ کلام سناؤ جو تم لوگ پڑھ رہے تھے، چنانچہ جب آپؓ کو قرآنِ مجید سنایا گیا تو آپؓ اس قدر متأثر ہوئے کہ اسی وقت دارِ ارقم، جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے، میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام کے اس واقعہ کو اگر کسی تنقید کے بغیر اسی طرح من وعن قبول کر لیا جائے تو آپؓ کی شخصیت کے بارے میں یہ منفی تاثر ابھرتا ہے کہ آپؓ ایک جذباتی انسان تھے اور زندگی کے اہم ترین فیصلے بھی جذبات ہی کے تابع کرتے تھے۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حضرت عمرؓ کو قرآنِ مجید اور دینِ اسلام کے بارے میں کچھ زیادہ غور وفکر کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ اسلام کے بارے میں زیادہ جانتے تھے، نیز اس واقعے سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ حضرت عمرؓ اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو کر مسلمان نہیں ہوئے بلکہ بہن کی استقامت اور وقتی حالات نے آپؓ کو اسلام کی طرف مائل کر دیا تھا۔

سطورِ بالا میں جو نتائج ذکر کئے گئے ہیں وہ بدیہی نوعیت کے ہیں۔ ان نتائج سے حضرت عمرؓ کی شخصیت کا وہ تاثر زائل ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر آپؓ کو تاریخ کی موثر اور نمایاں ترین شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی آپؓ کی شخصیت کے معترف ہیں۔ بالخصوص جس تدبر، تحمل مزاجی اور سیاسی حکمتِ عملی سے آپؓ نے ریاستِ مدینہ کو مستحکم اور مضبوط کیا وہ آپؓ کی شخصیت کا حقیقی تعارف ہے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت کے اصل جوہر تک رسائی کے لئے لا محالہ کتبِ سیرت سے ان تمام روایات کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جن کا تعلق جناب عمرؓ کی زندگی سے ہے، تاکہ آپؓ کی زندگی کی وہ دلنواز صورت سامنے آسکے جو آپؓ کے کارہائے نمایاں کے مطابق ہو۔ ان سطور میں محض اس قدر نشاندہی کرنا کافی ہو گا کہ ابنِ ہشامؒ (م ۲۱۸ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) اور دیگر مؤرخین نے حضرت عمرؓ کے بارے میں جو روایات ذکر کی ہیں۔ اگر ان روایات کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ تمام منفی تاثرات ختم ہو جاتے ہیں جن کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے[17]۔ تمام روایات کے مجموعی اور تنقیدی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ان کے قبولِ اسلام کا فوری سبب تو کہا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ دلی طور

---

[17] ابن ہشام، **السیرۃ النبویۃ**، ۱/۲۶۱-۲۶۶۔

Ibn-e-Ḥishām, *Al-Sīra Al-Nabawiyya, 1 :266-261.*

پر اسلام کی حقانیت کے پہلے ہی قائل ہو چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام میں تاخیر کے اسباب دیگر تھے جن کو باپ دادا کی روایات سے وابستگی اور گروہی عصبیت میں تلاش کرنا چاہیے۔

سیرت سے ہی متعلق اصحاب الفیل کا واقعہ مشہور و معروف ہے۔ یہ واقعہ سیرت نگاروں اور مؤرخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جبکہ مفسّرین نے یمن کے بادشاہ ابرہہ کے بیت اللہ پر حملے کا یہ واقعہ سورۃ الفیل کے پسِ منظر میں ذکر کیا ہے۔ عام طور پر یہ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ یمن کے عیسائی بادشاہ ابرہہ نے عربوں ہیں بیت اللہ کی عظمت اور حرمت سے حسد کرتے ہوئے اسے گرانے کا ارادہ کیا اور وہ اپنے ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ساٹھ ہزار کے ایک لشکر جرار کے ساتھ، جس کا ہر اول دستہ جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھا، بیت اللہ پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت مکہ کے سردار حضور ﷺ کے دادا جناب عبد المطلب تھے جو اپنی بے سر و سامانی اور کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے اہلِ مکہ کے ساتھ پہاڑوں پر منتقل ہو گئے۔ اسی دوران ابرہہ کے سپاہی ان کے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ جناب عبد المطلب اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ لے کر ابرہہ کے پاس گئے۔ ابرہہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور ان کے اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا تاہم ابرہہ نے ان کے اس سطحی مطالبے پر بڑی حیرانی سے پوچھا کہ آپ صرف اونٹوں کی بات کر رہے ہیں جبکہ آپ کی عزت اور شرف تو بیت اللہ کی وجہ سے ہے، جس کے تحفظ کی آپ نے سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ اس پر جناب عبد المطلب نے فرمایا کہ آپ میرے اونٹ واپس کر دیں، اس گھر کی حفاظت خود اس گھر کا خدا کرے گا۔ عام مفسّرین کے بیان کے مطابق قریش نے ابرہہ کا کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ان کے سردار عبد المطلب اپنی قوم کے ساتھ پہاڑوں میں جا چھپے اور بیت اللہ کو اللہ کے سپرد کر دیا کہ وہ خود اس کی حفاظت کرے گا[18]۔

اب اگر پورے واقعہ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ واقعہ کئی وجوہ سے محلِ نظر ہے۔ ایک، ابرہہ کے لشکر کی زبردست ہیبت کے باوجود لشکر کے راستے میں پڑنے والے تمام عرب قبائل نے اپنی طاقت کے مطابق بھر پور مزاحمت کی اگرچہ ان کو شکست کا سامنا ہی کرنا پڑا۔ مآخذ کے تفصیلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ یمن کے سردار ذو نفر نے اہلِ عرب کو ابرہہ کے خلاف باقاعدہ جنگ کے لئے آمادہ کیا، اگرچہ اس کو شکست ہوئی اور وہ قیدی بنا

[18] ابن ہشام، **السیرۃ النبویۃ**، ۱/۴۷-۵۸۔

Ibn-e-Ḥishām, *Al-Sīra Al-Nabawiyya, 1 :47-58.*

لیا گیا۔ اسی طرح بنو خثعم کے سردار نفیل بن حبیب الخثعمینے بھی ابرہہ کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ عرب قبائل نے یہ مزاحمت اس وجہ سے دکھائی کہ کوئی ان کو اور ان کی نسلوں کو بزدلی کا طعنہ نہ دے سکے۔ دوسرا، عرب قبائل میں سے صرف بنو ثقیف نے اہلِ عرب کی اس عام حمیّت کے خلاف ابرہہ سے صلح کی جس کہ وجہ سے پورے عرب میں ان کی ابرو مٹ گئی، اور ان کے ایک فرد ابورِغال نے ابرہہ کے لشکر کی مکہ کی طرف راہنمائی کی، اس غداری کی وجہ سے لوگوں نے ابورِغال کو کبھی معاف نہیں کیا اور اس کی موت کے بعد بھی لوگ ایک مدت تک لعنت کے طور پر اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ تیسرا، پورا عرب تو ابرہہ کے لشکر کی مزاحمت کر رہا ہو اور قریش، جن کی تمام عرب میں عزت ہی اس گھر کی وجہ سے تھی، وہ بغیر کسی مزاحمت کے دشمن کے سامنے سے ہٹ جائیں، یہ چیز عرب تمدن اور مزاج کے خلاف ہے، اور حیرت اس پر بھی ہے کہ لوگ ابورِغال کی تو قبر کو بھی معاف کرنے کے تیار نہیں ہیں لیکن قریش کی اس بزدلی پر کسی نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ چوتھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد اور نصرت کا یہ اصول قرآنِ مجید میں ذکر فرمایا ہے کہ اس کی مدد اور نصرت اس وقت نازل ہوتی ہے جب کوئی انسان اور قوم اپنی ساری کوششوں اور ظاہری اسباب کو اختیار کرنے کے بعد اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے تو وہ اپنے بندوں کی ضرور مدد کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر صرف اس وجہ سے عتاب فرمایا کہ انہوں نے قومِ عمالقہ سے لڑنے سے انکار کیا تھا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر بھی خدائی مدد اس وقت ہی اتری تھی جب پیغمبرؐ ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنا سب کچھ میدانِ جنگ میں جھونک چکے تھے۔ اس واقعہ کو اگر اسی طرح قبول کر لیا جائے تو اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ مسلمان بیت اللہ کی حفاظت کے مکلف نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ اللہ کا گھر ہے وہ خود اس کی حفاظت کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ پورے واقعہ کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو واقعے کی یہ شکل عربوں کے مزاج، قرآنِ مجید کے مسلمہ قانونِ نصرت اور جناب عبد المطلب کی سیرت کے خلاف نظر آتی ہے۔ حضرت عبد المطلب نے اس موقع پر جو دعا کی اور اللہ کی بارگاہ میں جن الفاظ کے ساتھ استغاثہ کیا وہ کسی شکست خوردہ اور ہارے ہوئے انسان کے نہیں ہیں[19]۔ اس لئے اصل حقائق تک رسائی کے لئے مآخذ کا تفصیلی اور تحلیلی مطالعہ ضروری ہے، جیسا کہ تاریخ اور سیرت کی تمام روایات کو ملا کر دیکھا جائے تو وہ تمام منفی تاثرات ختم ہو جاتے ہیں جن کا تذکرہ سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔

---

[19] الطبری، محمد بن جریر، **تاریخ الرسل**، (بیروت: دار التراث، ۱۳۸۷ھ)، ۱۳۸/۲۱۱۔

Al-Tabrī, Muḥammād Bin Jūraīr, Tarīkh al Rūsal, (Beīrūt: Dār Altūrās,1387),211/138.

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا معجزاتِ رسولؐ سے متعلق روایات کو زیر نظر تنقیدی اصول کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے؟ یہ سوال جس قدر اہم ہے اسی قدر اس کا اطلاق احتیاط کا متقاضی ہے، کیونکہ معجزات کے حوالے سے معروف مؤقف یہی ہے کہ معجزے کو عقل پر پرکھنا سب سے بڑی بے عقلی ہے۔ لہٰذا معجزات سے متعلق روایات پر اس اصول کا اطلاق کرتے ہوئے پوری احتیاط کی ضرورت ہے اور صرف ان ہی روایات پر تنقید ہوسکتی ہے جن کا دائرہ مخصوص افراد یا ماحول کے بجائے نظامِ کائنات اور جغرافیائی حقائق کے ساتھ ہو۔ مثلاً عام کتبِ سیرت میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہے کہ آپؐ کے اشارے پر معجزانہ طور پر سورج غروب ہونے کے بعد دوبارہ عصر کے وقت پر آگیا[20]۔ اسی طرح روایات کے مطابق سرداران مکہ کے مطالبے پر رسول اللہ ﷺ کے اشارے پر چودھویں رات کا چاند دو حصّوں میں تقسیم ہو کر دوبارہ جڑ گیا[21]۔ یہ اور اس سے بھی عجیب تر معجزات کا ظہور انبیاء کرامؑ سے ہوتا رہا ہے، لیکن محوّلہ بالا معجزات کا تعلق چونکہ پورے نظامِ کائنات کے ساتھ ہے، لہٰذا ان واقعات کی شہرت کا عالم گیر ہونا ایک بدیہی امر ہے اور لا محالہ اس کے عینی شاہدین کی تعداد بھی زیادہ ہونا لازم ہے۔ اس لئے اس نوعیت کی روایات کو صرف ایک آدھ فرد کے کہنے پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے خبر متواتر کے درجے کی شہرت اور زیادہ لوگوں کی گواہی درکار ہے، جیسا کہ انشقاق القمر کے معجزہ کے کافی شواہد موجود ہیں اور یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ دیگر محدّثین نے بھی مختلف اسناد کے ساتھ ذکر کی ہے جس کی وجہ سے یہ روایت خبر متواتر کے درجہ میں ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس نوعیت کی تنقید کے نتیجے میں اگر کوئی روایت ناقابلِ اعتبار قرار پائے تو یہ روایت کا انکار ہوگا اس کو معجزات کا انکار نہیں کہا جاسکتا۔ مذکورہ بالا واقعات اور روایات کا بطور مثال ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اصولی طور پر اگرچہ معجزات عقل سے ماوراء ہیں لیکن معجزات سے متعلق وہ روایات جن کا تعلق پورے نظامِ کائنات، جغرافیائی حقائق اور اقوامِ عالم سے ہو، ان کی جانچ پرکھ کے لئے اس اصول کا اطلاق ضروری ہے تاکہ کمزور روایات سے استشہاد کا دروازہ بند کیا جاسکے۔

---

[20] الطحاوی، احمد بن محمد، **مشکل الآثار** (بیروت: دار صادر)، 4، 2: 8۔9۔

Al-Ṭaḥāwī, Aḥmad Bin Muḥammad, *Muskil Al-Athār* (Beirut: Dar Ṣādir), 4, 2: 8-9.

[21] البخاری، محمد بن اسماعیل، **الصحیح البخاری**، (الریاض: دار السلام، 1999)، ۳۶۳۶۔

Al-Bukhārī, Muḥammad bin Ismā'īl, Ṣaḥīḥ al-Bukhārī, (Al-Riyadh, Dar al-Salam,1999), NO:3636

گذشتہ سطور میں کی گئی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ مجید سیرت نگاری کا اوّلین ماخذ ہے اور آپؐ چلتا پھرتا قرآن ہیں۔لازم ہے کہ سیرت نگاری کے اصولوں کے لئے قرآنِ مجید کو ہی بنیاد بنایا جائے۔غور کیا جائے توقرآنِ مجید کی ترتیبِ توقیفی کو سیرت نگاری میں بطور اصول پیشِ نظر رکھنا اصل میں سیرتِ محمدی کو زمان و مکان کی قید سے بالاتر قرار دینا ہے،اس نقطۂ نظر سے یہ اصول نبوتِ محمدی کی آفاقیت اور عالم گیریت کا شاندار اظہار بن سکتا ہے۔اسی طرح قرآنِ مجید نے سابقہ اقوام کے واقعات اور انبیاء کرامؑ کی سیرت نگاری میں پیغام کی مرکزیت کو جس طرح ملحوظ رکھا گیاہے ان تمام مناہج واسالیب کو بھی سیرتِ محمدی کے بیان میں بطور اصول اختیار کرنے سے سیرت کے نئے گوشے عیاں ہونگے۔

سفارشات

پورے مقالے میں جو بنیادی نکات اٹھائے گئے ہیں ان کو مدِّنظر رکھتے ہوئے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1} ادبِ سیرت پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کے مطابق سیرت نگاری ہمیشہ مسلمان اہلِ علم کا محبوب موضوع رہا ہے،لہٰذا آج بھی سیرت نگاروں کو یہ چیلنج درپیش ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق سیرتِ نبوی کو اپنا موضوع بنائیں۔

2} اسلام اور سیرتِ نبوی کو، اس کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں،ہمیشہ مغربی اہلِ علم کی توجہ حاصل رہی ہے ،تقریباًانیسویں صدی تک مغرب پر اسلام سے نفرت غالب تھی،بعد کے دور میں اس کی جگہ جدید اصولِ تحقیق اور "علمی دلائل" نے لے لی اور اب "غیر جانبدارانہ تحقیق" اور انصاف پسندی کے علمبردار بن کر مستشرقین اسلام اور سیرتِ نبوی پر اپنی تحقیقات پیش کر رہے ہیں۔اسلامی مصادر کی اشاعت کے بعد اہلِ مغرب کے لئے "علمی دھوکہ" اب آسان نہیں ہے، لیکن اب انصاف پسندی کے نام پر مختلف روایات سے من پسند مفہوم اُخذ کرنااور دور از کار تاویلات مستشرقین کا کامیاب ہتھیار ہے، زہر میں بجھی ہوئی ان تحریروں کا تنقیدی مطالعہ اہلِ علم پر قرض ہے۔

3} محدثینِ عظام نے "اصولِ حدیث" اور فقہاء کرام نے "اصول فقہ" کی صورت میں مستقل فنون ایجاد کئے اور اس پر مستقل کتب تصنیف کیں، لیکن "اصولِ سیرت نگاری" کے عنوان سے کوئی منظم تحریک سیرت نگاروں کے ہاں نظر نہیں آتی،لہٰذا قرآنِ مجید اور قدیم وجدید ادبِ سیرت پر گہرے تدبر کے بعد ایسے اصولوں کا تعین کرنے کی ضرورت ہے جو ہر دور میں سیرت نگاروں کے لئے بنیاد قرار پائیں۔

4} ادبِ سیرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نگاروں کے مخاطب صرف مسلمان ہیں اور ان کے قارئین صرف مسلمان ہی ہونگے لہٰذا کتبِ سیرت میں زیادہ مواد فضائل، شمائل اور معجزات پر ہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ختمِ نبوت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیرت کی عالمگیریت اور آفاقیت کو اجاگر کیا جائے، تاکہ یہ تاثر مضبوط ہو کہ رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں کی طرف رسول بن کر تشریف لائے تھے۔

5} سیکولرازم اور مغربی فکر وفلسفہ کے عالمگیر غلبے کے بعد مذہب کے حوالے سے کئی نئے سوالات نے جنم لیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نوعیت کے سوالات کو سیرتِ طیّبہ کی روشنی میں ایڈریس کیا جائے۔ مطالعۂ مذاہب کی طرز پر سیکولرازم اور مغربی فکر وفلسفہ کا سیرتِ طیّبہ کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ ضروری ہے۔ اس طرزِ فکر اور اسلوبِ تحریر سے سیرتِ طیّبہ کی آفاقیت خود بخود اُجاگر ہو گی۔

6} محدثین کی طرح جرح وتعدیل کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے راویانِ سیرت کے بارے میں بھی یہ طے ہو جانا چاہیے کہ ان میں سے کون سے راوی قابلِ اعتماد ہوں گے اور کن راویوں کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، تاکہ سیرت کا تقدس غیر محتاط راویوں کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچایا جا سکے، اسی طرح یہ بھی مناسب ہو گا کہ سیرت نگاروں کے لئے بنیادی مصادر کا تعین بھی حتمی طور پر کر دیا جائے، تاکہ مستشرقین اور دیگر معاندین کے لئے سیرت پر اعتراضات کا دروازہ تنگ کر دیا جائے۔

خلاصۂ بحث

اسلامی ادبیات میں کتبِ سیرت کی کثرت مسلمانوں کی رسول اللہ ﷺ سے والہانہ محبت کا واضح ثبوت ہے۔ مسلمان سیرت نگاروں نے رسول اکرم ﷺ کے فضائل، شمائل، معجزات اور معاملاتِ زندگی سے متعلق ہر پہلو کو جزئیات سمیت پوری تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ دنیا کے کسی بڑے راہنما اور کسی مذہب کے بانی کی زندگی کو اس انداز میں محفوظ نہیں کیا گیا۔ دورِ اوّل میں سیرت نگاروں کے پیشِ نظر سب سے بڑا ہدف یہ تھا کہ سیرت سے متعلق تمام معلومات کو محفوظ کر لیا جائے، اور حق یہ ہے کہ یہ مقصد پوری کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا گیا۔ دورِ اوّل میں سیرت نگار محدثین کی طرح اسناد کو بنیاد بنا کر روایاتِ سیرت کی جانچ پڑتال پر پوری توجہ نہ دے جس کے نتیجے میں بدیہی طور پر ذخیرۂ سیرت میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل ہو گئیں جو من گھڑت اور جعلی ہیں، ان معلومات میں سے بعض ناقص، ادھوری اور مزید تحقیق کی متقاضی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سیرت نگار بوجوہ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے جس کا اہتمام محدّثین اور فقہاء کے ہاں حدیث اور فقہ کی جمع وتدوین اور جانچ پڑتال میں نظر

آتا ہے۔ ذخیرۂ سیرت کی تنقیح نہ ہونے کے نتیجے میں ہر دور میں کتبِ سیرت میں ایسی روایات شامل ہوتی رہیں جو سراسر موضوع، من گھڑت اور بے سروپا ہیں، اور یہی وہ روایات ہیں جن کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے سیرتِ نبوی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رکھی ہے۔ سیرت پر مستشرقین کے اعتراضات کے نتیجے میں سرسید احمد خانؒ اوّلین لوگوں میں ہیں جنہوں نے روایاتِ سیرت کو کڑی تنقید سے گزانے کی ضرورت محسوس کی۔ سرسیدؒ کے بعد علامہ شبلیؒ نے اس رجحان کو ایک منظم تحریک کی شکل دی۔ دورِ حاضر میں ختمِ نبوت اور ایمان بالرسالت کا تقاضا یہ ہے کہ عصری احوال و ظروف میں ایک منظم تحریک کی صورت میں سیرتِ نبوی پر دادِ تحقیق دی جائے، اور رسالتِ محمدی کی آفاقیت کو اجاگر کیا جائے۔ سیرت نگاری کے اصولوں کے لئے قرآنِ مجید کو بنیاد بنانے کی ضرورت ہے۔ سیرت نگاری میں اس طرح کے تجربات عصر حاضر کی ضرورت ہیں، تاکہ ایسے قرآنی اصولوں کی روشنی میں سیرت پر تحقیقات کی جائیں جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆